

# اسلام میں اجتہاد کی اہمیت

پرویز

پچھلے دنوں اسلام آباد میں جو نوعیت کا نفرت منہمک ہوئی تھی اس میں مسلم مذاہب کے ممتاز علماء اور فقہانے شرکت کی تھی۔ اس میں زیر بحث موضوعات کو مشہور تھے اور ان پر اہم مقالات بھی پیش کئے گئے لیکن اس میں مرکزی خیال یہی تھا کہ اسلامی قوانین مرتب کرنے کے مسئلہ میں اجتہاد کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یعنی جو قوانین شریعت مروجہ جیسے آرسہ ہیں ان میں تبدیلی ہو سکتی ہے یا وہ ابدی طور پر غیر متغیر رہیں گے۔ کانفرنس کی جو کاروائی اخبارات میں شائع ہوئی اس سے مترشح ہوا کہ اس اہم ترین اور بنیادی حکمت کے متعلق شرکاء کانفرنس کے ذہن صاف نہیں تھے۔ طلوع اسلام اس موضوع پر غصے سے لکھتا چلا آ رہا ہے۔ کانفرنس کی روئداد سے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس بنیادی حکمت سے متعلق طلوع اسلام میں شائع شدہ اہم مقالات کو پھر سے شائع کیا جائے۔ چنانچہ ان کا آغاز پرویز صاحب کے مقالہ کے ایک خطاب سے کیا جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس حقیقت کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ طلوع اسلام میں شائع شدہ مقالات کی حقیقت اخباروں میں شائع شدہ خبروں کی سی نہیں سمجھ لی جودوسرے ہی دن پرانی ہو جاتی ہیں یہ قرآن کریم کے ابدی حقائق پر مشتمل مقالات ہوتے ہیں جن کی اہمیت بدستور باقی رہتی ہے اور انہیں غفلت و غور سے دیکھنا اور غور سے دیکھنا ضروری ہے اس اہمیت میں فرق نہیں آتا بلکہ وہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔

قرموں کی زندگی میں عبوری دور، بڑا ہی نازک، کشمکش انگیز، اضطراب خیز، شورش آئینہ، محروم سکون و مجبور طمانیت بر اکثر و بیشتر بائس پرور اور صبر رہا ہوتا ہے۔ ”عبوری دور“ سے مراد ہوتا ہے وہ زمانہ جس میں جو کچھ ہو چکا ہو یا چلا آ رہا ہے، وہ زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے، اور جو کچھ ہونا چاہیے، وہ ہنوز محسوس و مرتب شکل میں سامنے نہ آیا ہو۔ یہ وہی زمانہ ہے جس کی تصویر جرمنی کے شاعر آفاق مفاخر، ریلکے (RILKE) نے، ان حقیقت نگار الفاظ میں، مؤثر ترین انداز سے پیش کی ہے کہ

EACH TORPID TURN OF THE WORLD HAS SUCH

DISINHERITED CHILDREN,

TO WHOM, NO LONGER WHAT HAS BEEN, AND NOT

YET WHAT IS COMING, BELONG

اپنی تاریخ کی گزر گاہوں پر ایسے منہمک آئے ہیں جہاں زمانے کی حرکت کچھ دیر کے لئے ساکن ہو جاتی ہے۔ وہاں ہمیں

ایسے محروم المادہ، بچے نظر آتے ہیں جن کی حواسِ نصیبی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جو کچھ متواتر چلا آ رہا تھا، وہ ان سے چھین چکا ہوتا ہے، اور جس نے اس کی جگہ لینی تھی، وہ ہمنواز غمگیر و زنگار میں پہلو بدل رہا ہوتا ہے اور آب و تاب سے موزوں ہو کر سامنے نہیں آیا ہوتا۔ یہ، سالوں سوختہ اور مٹا ہوا بروہِ قیہم نسل، ہیم درجہ کے ان دورِ راہول میں عجیب کشمکش میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔

**ہماری موجودہ نسل** | پاکستان کی موجودہ تعلیم یافتہ نسل، اسی کشمکش میں مبتلا ہے، اور بری طرح مبتلا چڑھ چکی ہے۔ جن گھراؤں کا ماضی مذہبی روایات کے رشتوں سے بندھا ہوا ہے، ان میں اکثر بدتر اس قسم کی گفتگو سُننے میں آئے گی۔ اس نسل کا جواں سال نمائندہ کہے گا :-

ہم مکرش نہیں ہونا چاہتے۔ ہم تہذیب و اخلاق کی حدود شکنی پسند نہیں کرتے۔ ہم شرافت و نجات کی انسانیت ساز زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن چچا جان! آپ سوچئے تو سہی کہ ہم سے مطالبہ کیا کیا جا رہا ہے؟ دنیا بھر دنوں سال آگے بڑھ چکی ہے۔ زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہے۔ زندگی کے تقاضے کچھ سے کچھ بڑھ چکے ہیں۔ زینت کے انداز بدل چکے ہیں۔ تمدن و معاشرت کی روشیں بدل چکی ہیں۔ زندگی کا ہر نظام — سیاسی، معاشی، تمدنی، ترقی، بین الاقوامی ایک ایک کر کے، نئے قالبوں میں ڈھل چکا ہے۔ نکل کی فرسودہ لاریں پائس ہو چکی ہیں۔ سوچ کے طور طریق بدل چکے ہیں۔ غرضیکہ زندگی کے ہر پہلو میں تبدیلی آچکی ہے۔ لیکن ہم سے کہا جا رہا ہے کہ تم اسی انداز کی زندگی بسر کئے جاؤ جس انداز کی زندگی آج سے ہزار سال پہلے بسر کی جاتی تھی۔ تم اپنے اوپر انہی پابندیوں کو عائد کرو جو پابندیاں صدیوں پہلے کے انسانوں پر عائد کی گئی تھیں، تم سوچو تو انہی کے دماغ سے، سمجھو تو انہی کے دل سے، دیکھو۔ تو انہی کی آنکھوں سے، سنو تو انہی کے کانوں سے۔ تم انہی کے متعین کردہ راستوں پر چلتے رہو، انہی کی وضع اور اختیار کردہ روشوں پر گامزن رہو۔ تم ہر نظریہ کو انہی کے پیالوں سے مایہ، ہر عقیدہ کو انہی کی کسوٹی پر پرکھو جسے وہ غلط کہہ چکے ہیں، اسے غلط کہو، جسے انہوں نے صحیح قرار دیا ہے اسے صحیح سمجھو۔ یہ ہے جو ہم سے کہا جا رہا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہم سے کہا جا رہا ہے کہ اگرچہ تم بیس چوبیس سال کے جوان ہو چکے ہو لیکن تمہیں وہی جوتا پہنا پڑے گا جو تمہیں دس سال پہلے بنا کر دیا تھا کیونکہ وہ حقیقت ساز اپنے زمانے کا بہترین کار بگر تھا۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ اس دس سال کے عرصہ میں ہمارے پاؤں کتنے ہی بڑھ گئے ہیں اور جوتا اتنے کا اتنا ہی ہے، اس لئے اب وہ فٹ نہیں بیٹھتا تو ہمیں کوسا جانا ہے کہ تم بدقیتر ہو گئے ہو، گستاخ ہو گئے ہو۔ بڑوں کے سامنے بولتے ہو، بزرگوں کا ادب احترام نہیں کرتے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم اس کا کیا جواب دیں! ہمیں یہ علامہ اقبالؒ کے اس قسم کے شعر سناتے رہتے ہیں کہ

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا رگ ہے ساز بدلے گئے

لیکن جب ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ ابا جان! زمانے کے انداز بدلے جا چکے ہیں، اس لئے ہمیں بھی ایسے آئین و ضوابط میں تبدیلیاں کرنی چاہئیں تاکہ، یہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے پورے کر سکیں تو ہمیں ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ زمانے کے حالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں اور اس کے تقاضے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائیں، یہ آئین و ضوابط ایسے ہی رہیں گے اور ان کی پابندی اسی طرح کرنی ہوگی۔ یہ شریعت کے احکام ہیں جن میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ ہمارے اسلاف کے فیصلے ہیں جو ہم سے زیادہ سمجھدار تھے اور زمانے کے تقاضوں کو ہم سے کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ اور پھر وہ بزرگ فتویٰ اور پرہیزگاری میں اس مقام پر پہنچے کہ جس کی گرد کو بھی تمہارا زمانہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے ہم ان کے خلاف ایک لفظ تک سننا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ ان کی سوء ادبی ہے۔ یہ زمانہ ہی گستاخوں اور بے ادبوں کا آگیا ہے۔

اور جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو آپ ہی فرمائیے، چچا جان! کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

گھروں کے اندر تو بات یہیں تک پہنچ جاتی ہے، لیکن جب یہ موضوع محراب و منبر سے چھڑتا ہے تو جس قدر لشکر آلود پیشانیوں، قہر آمیز نگاہوں اور کھٹ بردہاں سیلابوں کے ساتھ قوم کے نوجوانوں کو ہدفِ طعن و تشنیع اور نشانہ و سب و شتم بنایا جاتا ہے، اور جس جس قسم کے کفر و الحاد کے جگر پاش فتوؤں اور بے دینی و بے حیائی کے نفرت انگیز القابوں سے انہیں نوازا جاتا ہے، اس سے کون سا کان نا آشنا اور کون سا قلب نامانوس ہے؟ اور اس کے ردِ عمل میں، جب یہ نوجوان کافی ہاؤسوں میں اس سوال کو موضوع گفتگو بناتے ہیں، تو پھر کون سی بھتی ہے جو قدامت پسندوں کے خلاف کسی نہیں جاتی، اور کون سا فقرہ ہے جو مذہب پر سقوں پر چست نہیں کیا جاتا ہے۔

قوم کی کشتی، افراط و تفریط کے اسی گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ دریا کی تلامخ چیزیاں، لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہیں اور ان کے تھپیڑوں سے کشتی روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوئی جا رہی ہے۔ وہ ناخدا جن کے ذمے اس کی حفاظت و سلامتی تھی، اسے بھنور میں چھوڑ کر لب ساحل آرمیہ میں۔ اور نہایت فتن و شوق اور جذب و انہماک سے اس کے ڈوبنے کا تاثر دیکھ رہے ہیں۔ آئیے فرصت کے ان چند لمحات میں ہم دیکھیں کہ اس کشش مکش کی حقیقی وجہ کیا ہے اور اس کشاکش کا اصل کیا؟

پہلے ہم ان نوجوانوں کو دیکھتے ہیں کہ انہیں سنبھالنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اگر ہمارے یہ نوجوان ان پڑھ قسم کے عامی ہوتے تو ہم ان سے کہتے کہ ایک سچے بیس سال کا چھوٹا چالیس، پچاس، ساٹھ، ستر سال کا بھی کیوں نہ ہو جائے، اس کی شکل و شبہات، تعلیم یافتہ طبقہ | قد و قامت، وضع قطع، بود و ماند، خصلت و قابلیت اس کے ایمان و عواطف، اس کے رجحانات و میلانات، غرضیکہ اس کی زندگی کے ہر عنصر میں تبدیلی آجائے گی۔



لیکن ایک حقیقت ایسی ہوگی جس پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ اس زندگی کے پہلے دن سے آخری دن تک، اٹل اور غیر متبدل رہے گی۔ یعنی یہ کہ اس کے ہاں باپ کون ہیں۔ اس حقیقت کو نہ وہ بدل سکتا ہے، نہ زمانے کے تقاضے اس میں ذرا سی بھی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ لہذا، ہمارے ان نوجوانوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ زمانے کے بدلنے سے ہر شے میں تبدیلی آ جانی چاہیئے۔ دنیا میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی کیفیت یہ ہے کہ:

نہ وہ بدلے، نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی

میں کیسے اعتبار انقلاب آسمان کروں؟

لیکن چونکہ ہمارا یہ نوجوان طبقہ تعلیم یافتہ ہے اس لئے ہم ان سے، ان کی ذہنی سطح پر، ان کی زبان میں گفتگو کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ زمانے کے بدلنے والے تقاضے بجا اور درست، لیکن کیا زندگی کی بعض حقیقتیں ایسی نہیں جن پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جگہ اٹل اور محکم رہتی ہیں۔ کیا سائنس کے بنیادی قوانین، زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں؟ کیا جیومیٹری کی (PROPOSITIONS) آج بھی وہی نہیں جو آج سے تین ہزار سال پہلے تھیں، جب وہ دریافت ہوئی تھیں۔ کیا ریاضی اور الجبرا کے اساسی اصول، ان ازل تا ابد، بغیر متبدل نہیں رہتے۔ کیا حساب کا یہ ابتدائی ساگر کہ دو طاق عددوں (ODD NUMBERS) کی حامل جمع ہمیشہ جفت (EVEN) ہوتی ہے، کسی حالت اور کسی زمانے میں بھی قابل تغیر و تبدل ہو سکتا ہے! لہذا، یہ مطالبہ کہ زمانے کے حالات کے بدل جانے سے، ہر شے میں تبدیلی پیدا کر لینی چاہیئے، دنیا کے علم و حضارت میں ناقابل تسلیم قرار نہیں پاسکتا۔ زمانے کے تقاضے لاکھ بدلیں، ناقابل تغیر حقیقتیں ہمیشہ ناقابل تغیر رہیں گی۔

اور دوسری طرف ہم اپنے قدامت پرست بزرگوں کی خدمت میں عرض کریں گے کہ زندگی بقا کے لئے غذا کی ضرورت لاینفک ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس میں نہ نوع انسانی کی پوری تاریخ میں کبھی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ ہی کسی فرد کی زندگی میں اس میں استثناء پایا گیا ہے۔ یہ زندگی کا بغیر متبدل قانون ہے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ اس پر بھی غور فرمائیے کہ یہ تفصیل کہ آپ کس قسم کی غذا کھاتے ہیں، کس طریق سے کھاتے ہیں، کن کن اوقات میں کھاتے ہیں، ایسی ہیں جن میں ہر زمانے میں، ہر قوم میں، ہر ملک میں، تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جسے کہ ایک فرد کی زندگی کے مختلف ادوار اور مختلف حالات میں ان میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ آپ کی بچپن کے زمانے کی غذا اور بھتی، جوانی کی اور، اور بڑھاپے کی، ان دونوں سے مختلف۔ تندرستی کے زمانے میں غذا اور ہوتی ہے، بیماری کے دنوں میں اور۔ سردی میں اور قسم کی غذا کھانی پڑتی ہے۔ گرمی میں اور قسم کی۔ کلیہ غیر متبدل ہے لیکن اس کی علی جزئیات میں، حالات کے بدلنے سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

ان تبدیلی تصورات کے بعد آئیے ہم دیکھیں کہ ایک مسلمان کی زندگی میں کیا کیا چیزیں غیر متبدل ہوتی ہیں اور کون سی ایسی، جن میں حالات کے مطابق تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ یہ سوال صرف اس لئے اہم نہیں کہ اس

سے ہماری قدیم اور جدید نسل میں ایک شدید کشمکش پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی اہمیت کی، اس کے علاوہ، ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ وجہ بنیادی ہے۔ اسے غور سے سمجھئے۔

اس مطالبہ میں کسی کو بھی اختلاف نہیں کہ پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں، لیکن اس کے باوجود، اس تیس سال کے عرصہ میں، ان قوانین کی ترتیب و تدوین کے لئے ایک عملی قدم بھی نہیں اٹھایا جاسکا۔ یہ اس لئے کہ ابھی تک یہ بنیادی سوال طے نہیں پاسکا کہ اسلامی قانون کہتے کسے ہیں۔

اس میں کون کون سے اجزاء غیر متبدل ہیں اور کون کون سے | **پاکستان میں بنیادی سوال**

ایسے جن میں، بہ تغیر حالات تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ متبصر کمیٹی میں یہ سوال اٹھایا گیا تو علماء حضرات نے کہا کہ اسلام میں، مکمل ضابطہ قوانین پہلے سے موجود ہے جس میں نہ کسی اضافہ کی ضرورت ہے، نہ کسی تبدیلی کی اجازت۔ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس ضابطہ قوانین کو مدن و عن نافذ کر دے اور اگر کسی مسئلہ کی تعبیر و تشریح کی ضرورت پڑے تو علماء کی طرف رجوع کرے۔ دوسری طرف، ارباب بست و کشاد، جن کے سر پر ملکی قوانین کو عملاً نافذ کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، یہ محسوس کرتے تھے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر، علماء کے پیش کردہ ضابطہ قوانین کو مدن و عن نافذ کرنا ناممکن ہے۔ لیکن ان کی کمزوری تھی یا تقاضائے مصلحت کہ وہ جس حقیقت کو محسوس کرتے تھے اُسے کھلے کھلے الفاظ میں زبان پر نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ اس دوران میں جتنی حکومتیں قائم ہوئیں، ہر ایک نے اسی میں عافیت سمجھی کہ دستور میں تو یہ شق لکھ دی جائے کہ ملک کے قوانین اسلامی یعنی کتاب و سنت کے مطابق۔۔۔۔۔ ہوں گے لیکن اس سے آگے کسی نے ایک قدم بھی نہ اٹھایا۔ ہر ایک کی یہی کوشش رہی کہ یہ سوال کسی نہ کسی طرح ٹلنا پھلا جائے۔ دوسری طرف علماء حضرات بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے ہاں تو ایک طرف، دنیا نے اسلام میں کسی جگہ بھی کوئی ایسا ضابطہ قوانین موجود نہیں جسے تمام فرقوں کے مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرتے ہوں۔ نہ ہی فرقوں کی موجودگی میں ایسا ضابطہ قوانین مرتب ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ بھی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ یہ سوال عملاً سامنے آئے ہی نہیں۔ میرا تعلق، نہ ارباب حکومت سے ہے نہ اہلائے شریعت سے۔۔۔۔۔ اخیال کے الفاظ میں، میں ج

نے اہل مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند  
میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ اور میرا مسئلہ یہ ہے کہ زندگی کا کوئی مسئلہ سامنے آئے، قرآن کی بارگاہ سے پوچھوں کہ اس کا حل کیا ہے۔ قرآن کریم پر غور و تدبر سے، اس اہم ترین اور (بظاہر) مشکل ترین مسئلہ کا حل، میری بصیرت کے مطابق مجھے مل سکا ہے۔ اسے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت ہماری قوم اس (Mod) ہی میں نہیں کہ کسی مسئلہ پر

سخنہ گی سے غور کر سکے۔ اس کے باوجود، میں اس سوال کو سامنے لا رہا ہوں، اس امید پر کہ شاید اس کے بعد ہمارا تعصب یاوری کرے اور قوم اس قسم کے بنیادی مسائل حیات پر غور و فکر کی ضرورت محسوس کرے، تو میری قرآنی فکر کے یہ نتائج اس کے کسی کام آسکیں۔ ورنہ اس وقت تو یہ مثال یہ مری کو شمش کی ہے کہ ہر رخ اسیر کرے قفس میں فراہم حسن آئیاں کیلئے

(۲)

انسان کو جب اس دنیا میں بسایا گیا تو اس سے کہہ دیا گیا کہ زندگی کے بنیادی مسائل کا اطمینان بخش حل نہا عقل کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے تمہیں آسمانی راہ نمائی ملتی رہے گی۔ وَمَنْ يَتَّبِعْ هَذَا فَلَاحٌ حَقٌّ عَلَيْهِمْ وَلَا هَظَرٌ بِيَحْزَنُونَ۔ (پہلے) جو اس راہنمائی کا اتباع کرے گا وہ بلا خوف و خطر اور بے حزن و ملال منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اس راہ نمائی کے لئے پروگرام تو یہی تھا کہ زندگی کے بنیادی اور غیر متبدل اصول و اقدار کو وحی کی روش سے دیا جائے اور اس بات کو ہر دور کے انسانوں پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق عمل طریق کار خود وضع کریں۔ لیکن شروع شروع میں انسانی عقل و شعور خام اور اس کا تجربہ ناپختہ تھا، اس لئے ان اصولوں کی بیشتر جزئیات بھی خود وحی کی روش سے متعین کر دی جاتی تھیں۔ مثلاً جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا کہ وہ اپنے واسے سیلاب سے محفوظ رہنے کے لئے کشتی بنائیں، تو کشتی بنانے کا طریق بھی وحی کی روش سے بنایا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ: وَصْنَعِ الْفُلَ يَا عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ خُذْ بِكَ ثَمَرَاتِ الْجِبَالِ فَاصْدُقْ بِهَا ذَاتِ الْاُفْهَامِ۔ (پہلے) تم پہاڑی زمینگرائی، پہاڑی وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔ اس طرح ایک رسول، غیر متبدل اصول و ضوابط اور اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق، جزئیات و تفصیل اپنی امت کو دے کر چلا جاتا۔ لیکن اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ہوتا یہ کہ اس کے نام لیوا، مذہبی پیشوا، اپنی مفاد پرستیوں کے لئے، اس کی وحی میں اپنے خیالات کی آمیزش کر دیتے اور کہیں وہ دست برد زمانہ سے ویسے ہی تلف ہو جاتی۔ اس کے بعد ایک اور رسول آ جاتا اور ایک جدید ضابطہ حیات بذریعہ وحی دے دیتا۔ اس میں غیر متبدل اصول تو وہی ہوتے، جو سابقہ رسول کی وحی میں تھے لیکن جزئی احکام کا از سر نو جائزہ لیا جاتا۔ ان میں جو احکام ایسے ہوتے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی انہیں علی حالہ رہنے دیا جاتا۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ان کی جگہ جدید احکام دے دیئے جاتے اور عند الضرورت ان میں اضافہ بھی کر دیا جاتا۔ یہی وہ نظام وحی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ: مَا تَنصُرُ مِنْ شَيْءٍ اَوْ تَنْصِيهَا تَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ يَكْلِفُهَا۔ (پہلے) جو سابقہ حکم ہم منسوخ کر دیتے تھے اس کی جگہ اس سے بہتر حکم نازل کر دیتے تھے۔ اور جو احکام ایسے تھے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی میسکی انہیں فراموش کر دیا گیا تھا، ان کی دوبارہ

طا اور اب قواعد اس سے کہیں زیادہ تاسف انگیز ہے۔



تجدید کر دی جاتی تھی۔ دوسرے مقام پر اسے "تبدیل احکام" کے پر وگرام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۱۶)۔

یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ تاریخ افسانیت میں اس دور کا آغاز ہو گیا جس میں ذہنی انسانی نے بلوغت تک پہنچ جانا تھا۔ اسکی علمی اور فکری صلاحیتوں میں پختگی آ جاتی تھی۔ اس کے تجربہ اور مشاہدہ کے میدان، افق، تا افق پھیلنے چلنے جانے لگے۔ تو اس وقت نوع انسان کو وحی کی رو سے آخری ضابطہ حیات عطا کیا گیا جسے قرآن کریم کہا جاتا ہے۔ اس میں کچھ تو جزئی احکام تھے اور باقی زندگی سے متعلق وہ ابدی اصول و اقدار جو شروع سے

## آخری ضابطہ حیات

غیر متبدل چلے آتے تھے اور جنہیں، قوانین کائنات کی طرح، ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہنا تھا۔ انہی اصولوں کے متعلق کہا گیا کہ: **مَشْرَعَ لَكُمْ مِنْ الدِّينِ مَا وَصَّي بِهٖ نُوْحًا وَّ اِلٰهٖ اٰدَمَ وَّ اٰلِہٖٓ عَلَیْہِٖ سَلٰمٌ وَّ اٰلِہٖٓ عَلَیْہِٗ سَلٰمٌ وَّ اٰلِہٖٓ عَلَیْہِٗ سَلٰمٌ وَّ اٰلِہٖٓ عَلَیْہِٗ سَلٰمٌ**۔ (۲۳)۔ تبار سے لئے بھی وہی التین۔ ضابطہ حیات۔ تجویز کیا گیا ہے جو انبیائے سابقہ۔ مثلاً نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کی طرف وحی کیا گیا تھا۔ ان سے بھی ہم نے یہی کہا تھا۔ اور ہمیں بھی اسی کی تاکید کی جاتی ہے۔ کہ اس ضابطہ حیات میں کسی قسم کا اختلاف اور تفرقہ پیدا نہ کرنا۔ اس لئے کہ زندگی کے اساسی قوانین و اقدار میں اختلاف یا تفرقہ، نظام حیات کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ یہی وہ التین۔ غیر متبدل اصول حیات کا ضابطہ۔ تھا جس کا مہمبین (محفوظ ریکارڈ) قرآن کریم تھا (۲۴)۔ ان کے علاوہ جو کچھ اقوام سابقہ کو بذریعہ وحی دیا گیا تھا، وہ احکام شریعت تھے جو قابل تغیر و تبدل تھے۔ انہی کے متعلق کہا تھا کہ: **لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شُرْعَةً وَّ مِثْقَالًا**۔ (۲۵)۔

## اہل کتاب کا اعتراض

سابقہ مذاہب کے پیرو (اہل کتاب) چونکہ ان جزئی احکام کو بھی ناقابل تغیر و تبدل سمجھتے تھے، اس لئے وہ اعتراض کرتے تھے کہ اگر یہ دین، جسے رسول اللہ ﷺ پیش کرتے ہیں، وہی ہے جو انبیائے سابقہ کو دیا گیا تھا تو قرآن کے بعض احکام، ان کے ہاں کے احکام سے مختلف کیوں ہیں؟ ان سے کہا گیا کہ اقل تو تم نے اپنے رسول کے عطا کردہ ضابطہ ہدایت میں تحریف کر دی اور دوسرے یہ کہ ان جزئی احکام میں تبدیلی ضروری ہے۔ التین، ناقابل تغیر اصولوں کا نام ہے۔ ان کے متعلق کسی قسم کا تنازعہ نہیں کیا جاسکتا۔ **لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مِثْقَلًا**۔ (۲۶)۔ اس سے واضح ہے کہ الامر غیر متبدل اصول دین ہے، اور بدلتے رہنے والے احکام، مناسک و مناسج۔ انہی اصولوں کو، جو آخری مرتبہ قرآن میں دیئے گئے تھے، مکمل بھی کہا گیا اور غیر متبدل بھی۔ **وَرَسَلْنَا رُسُلًا بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ**۔ (۲۷)۔ تیرے رب کے کلمات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ انہیں قرآن کریم میں مکمل کر دیا۔ اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خد خدائے لے لیا۔

اِنَّا نَحْنُ مُخْلِطُوْنَ الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَكُمۡ لَحٰفِظُوْنَ۔ (۵۱) تم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ باب نبوت ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

قرآن کریم کا یہ حصہ دین کے اصولوں سے متعلق ہے۔ جہاں تک ان احکام کا تعلق ہے جو اس میں مذکور ہیں، وہ بھی کم و بیشی اصولی نوعیت کے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہر حکم، خاص شرائط سے مشروط ہوتا ہے۔ اور اسے خاص حالات کے تحت نافذ کیا جاتا ہے۔ مگر قرآن میں نہ تو ان احوال و ظروف کا تعین کیا گیا ہے جن کے مطابق ان احکام کو نافذ کیا جائے گا اور نہ ہی ان شرائط کا ذکر ہے جن سے وہ مشروط ہوں گے۔ (مثلاً) اس میں سرفتہ (چوری) کو قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سرفتہ کی تعریف (DEFINITION) خود متعین نہیں کی۔ اس لئے اضطرابی حالت میں حرام چیزوں کے کھانے کی اجازت دی ہے لیکن ان حالات و کیفیات کی وضاحت نہیں کی جنہیں اضطرابی کہا جائے گا۔ اس نے خمر اور میسرہ کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن ان کی نوعیتوں اور شکلوں کی تصریحات خود بیان نہیں کیں۔ اس نے ان کا تعین انہماؤں پر چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ احوال و ظروف بدلتے رہتے ہیں اور نہ ہی شرائط غیر متبدل ہو سکتی ہیں۔

## یہی الدین ہے

یہ ہیں وہ اصول و اقدار اور احکام و ضوابط جو قرآن میں مذکور ہیں۔ انہی کے مجموعہ کا نام ”الدین“ ہے۔ جن امور کے متعلق قرآن خاموش ہے، ظاہر ہے کہ ان کا تعلق دین سے نہیں۔ ان کے متعلق اس نے مسلمانوں سے تاکید اکہد دیا کہ ان کی بابت خواہ مخواہ کرید مت کرو۔ اگر ان کا تعلق دین سے ہوتا تو انہیں ہم خود ہی بتا دیتے۔ سورۃ بائدہ میں ہے۔ مَآ یَشَآءُ الذِّیۡنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ شَیْءٍ اِنْ تَبَدَّلَ لَکُمۡ لَسُوْکُمْ۔ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِیۡنَ یُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبَدَّلَ لَکُمۡ۔

اے جماعتِ مومنین! جن امور کے متعلق زبانِ وحی خاموش رہی ہے، ان کے متعلق خواہ مخواہ سوالات مت کرو۔ ابھی نزولِ وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ تمہارے سوالات کے جواب میں اگر وحی کی رو سے کچھ مزید احکام دے دیے گئے تو وہ تمہیں ناگوار گزریں گے۔ سو تم مفت میں بیٹھے بٹھائے اپنے اوپر پابندیاں عاید کرانے کا موجب کیوں بنتے ہو؟ قُلْ مَا لَہَا قُوْمٌۭ وَتَ قَبْلَکُمۭۡ شَمٌّۭ اَصْبَحُوْا بِہَا کٰفِرِیۡنَ۔ (۵۲) تم سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) ایسی طاقت کر چکی ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اپنے اوپر قسم قسم کی پابندیاں عاید کر کے زندگی کو ناقابل برداشت زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اور جب انہیں تباہ نہ سکے تو دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔ تم ایسا نہ کرنا۔ جن امور کے متعلق وحی خاموش رہی ہے، یہ نہیں کہ ہم ان کے متعلق ہدایت دینا بھول گئے ہیں۔ ہم دانستہ خاموش رہے ہیں کہ ان امور کا تعلق دین سے ہے ہی نہیں۔ اس لئے ان کے سلسلہ میں کوئی پابندیاں نہیں لگائی گئیں۔ اس آیتِ حلیہ کی تشریح حضور نبی اکرم نے



نے ایک حدیث میں یوں فرمائی ہے کہ: **إِنَّ اللَّهَ صَوَّضَ فِرَاقِي فَلَا تَصْبِعُوا هَا وَحَرَّمَ حُدُومَاتِ فَلَا تَسْتَهْكُمُوهَا - وَحَدَّ حُرُودًا فَلَا تَعْتَدُوا حَا وَتَسْكُتُ عَنْ أَشْيَاءٍ مِّنْ غَيْرِ نَيْسِيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا -** اللہ نے کچھ اور کو فرض قرار دیا ہے، انہیں نہ مت کر دو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، ان کے پاس تک نہ پھینک دو۔ کچھ حدود و مستحبات کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور دیگر امور کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے، ان کے متعلق کرید مت کر دو۔ یاد رکھو! جن باتوں کے متعلق اللہ نے خاموشی اختیار کی ہے، اس نے دانت ... .. (معاذ اللہ) بھول گیا ہے۔ (مشکوٰۃ: باب تمسک بحجاب و سنت)

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

**حاصل بحث** | لہذا حکام بالا سے واضح ہے کہ ختم نبوت کے بعد، انسانی راہ نمائی کی صورت یہ فرما رہی ہے کہ:-

۱۔ جن امور کے متعلق قرآن کریم نے اصولی راہ نمائی دی ہے، جماعت مومنین، یعنی اسلامی مملکت، اُمت کے مشورہ سے، اپنے حالات کے مطابق، یہ خود طے کرے کہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا جائے۔

۲۔ جہاں تک احکام قرآن کا تعلق ہے، اسلامی مملکت ان مواقع، حالات اور شرائط کا تعین کرے جن کے مطابق انہیں نافذ کیا جائیگا۔

۳۔ اسلامی مملکت اس امر کا بھی فیصلہ کرے کہ قوم کے موجودہ حالات کیا ہیں، اور قرآنی اصول و احکام کو کس طرح نافذ کیا جائے کہ وہ تدریجاً آہستہ آہستہ، آخری منزل تک پہنچ جائے۔ یعنی نصب العین تو قرآن نے متعین کر دیا ہے۔ اس نصب العین تک تدریجاً پہنچنے کیلئے عمل پر ہر گرام حالات کے تقاضا کے مطابق، خود وضع کرے۔ کسی قوم کو اس کی آخری منزل تک لے جانے کے لئے، اصول تدریج و اہمال کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے

**اصول تدریج** | کہ خود اللہ تعالیٰ نے بھی، نزول وحی میں اس اصول کو پیش نظر رکھا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت ہے کہ:-

پہلے مفصل سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے (یعنی ترغیب و ترہیب سے متعلق آیات)۔ پھر جب لوگ اسلام پر قائم ہو گئے، تو حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ (مثلاً) اگر شراب نہ پینے کا حکم شروع ہی میں نازل ہو جاتا تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر ابتدا ہی میں زنا کی ممانعت کا حکم نازل ہو جاتا تو لوگ اس کے چھوڑنے سے بھی انکار کر دیتے۔ (بخاری باب تالیف القرآن)

زنا سے غالباً مراد ہیں نکاح کے وہ طریقے جو عربوں کے ہاں رائج تھے، لیکن جنہیں قرآن کریم نے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ امتناع شراب کے احکام میں جس تدریج کو ملحوظ رکھا گیا وہ اس باب فکر و نظر کے لئے جڑی

بصیرت افزا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کی گھٹی میں شراب پڑ چکی ہو، جو نسل بعد نسل اس کی عادی چلی آ رہی ہو۔ کیفیت و مستی جس کے نوح کے ذرات میں جلول کر چکے ہوں، اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ایک لحمت شراب چھوڑ دے۔ وہ اسے تدریج ہی چھوڑ سکے گی۔ اسی مہکت کے پیش نظر قرآن کریم میں پہلے یہ آیا کہ خمر و میسرہ میں فوار بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ لیکن ان کے نقصان، ان کے فوائد سے زیادہ ہیں۔ (۱۱۴/۱) پھر یہ کہا گیا کہ: لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ (۱۱۴/۲) تم نشہ کی حالت میں اجتماعاتِ صلوٰۃ میں شریک نہ ہو کرو، اور اس کے بعد، تیسری منزل میں، اس کی قطعی ممانعت کی گئی۔ (۱۱۴/۳) یہ ممانعت مدینہ میں آ کر ہوئی۔ اسی طرح قرآن کریم کے دیگر احکام پر نگاہ ڈالیں۔ نظر آ جائے گا کہ اس نے اپنی اولین مخاطب قوم کی معاشرتی اور تمدنی سطح، اور ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کو سامنے رکھ کر، ان احکام کو اس طرح تدریج نازل کیا کہ وہ قوم تیس سال کے عرصہ میں، اس پروگرام کے نقطہ اول میں سے آہستہ آہستہ آخری منزل تک لے جاتی گئی۔ جن سطح میں نگاہوں کے سامنے یہ بنیادی حقیقت نہیں، انہیں قرآنی احکام میں جا بجا تضاد نظر آئے گا۔ حالانکہ قرآن کریم نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ: وَتَوَكَّلْ عَلَىٰ عِزِّ اللَّهِ (۱۱۴/۲) تو جفا و اختلافاں گھبراؤ، اختیاراً۔ (۱۱۴/۲) اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں تم بہت سے اختلاف پاتے۔ تضادات کے اسی غلط تصور نے یہ عقیدہ وضع کرا دیا کہ قرآن کی بعض آیات، دوسری آیات سے منسوخ ہو چکی ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر اعلیٰ ہے اور اس کا کوئی حکم منسوخ نہیں۔ ناسخ و منسوخ کا تصور ہی غیر قرآنی ہے۔ اس کے احکام احوال و ظروف سے مشروط ہیں اور ان کا اطلاق موقع و محل کے مطابق ہوتا ہے۔ تدبر فی القرآن سے مراد یہ ہے کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ ہمارے جو حالات اس وقت ہیں، ان میں قرآن کا کونسا حکم نافذ العمل ہونا چاہیے۔ اگر کون کوئی شرائط سے مشروط اور کس کس قسم کی وجہ سے مقید۔ یہ شرائط و قیود، قرآن کریم کی اصولی راہ نمائی کی روشنی میں، حالات کے مطابق متعین کی جائیں گی۔ یہ کام اسلامی مہکت کے کرنے کا ہے، نہ کہ افراد یا نجی اداروں کا۔

### ناسخ و منسوخ کا عقیدہ

(۱۰)

قرآنی راہ نمائی کے مطابق سب سے پہلی مہکت، نبی اکرم ﷺ نے متشکل فرمائی۔ اس سلسلہ میں حضورؐ کو حکم دیا گیا کہ: وَبَشِّرْهُمْ فِي آخِرِهِمْ (۱۱۴/۲) معاملات میں، اخلاقی امت (یعنی اپنے رفقاء) سے مشورہ کیا کرو۔ قرآن کریم کے احکام اور اصول و اقدار سب منزل من اللہ تھے۔ ان میں خود رسولؐ اللہ کے ذاتی خیالات و افکار کا بھی کوئی دخل نہیں تھا چاہے ان کے لیے اس سلسلہ میں دوسروں سے مشورہ لیا جاتا۔ جو کچھ مشاورت سے طے کیا جانا مقصود تھا وہ بھی تھا کہ جو حالات اس وقت درپیش ہیں، ان کی روشنی میں، قرآنی اصولوں

### پہلی اسلامی مہکت

کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے کس قسم کے جزئی ضوابط مرتب کئے جائیں، اور جو احکام قرآن میں آئے ہیں انہیں کونسی شرائط و حدود کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ ان امور کے فیصلے، یا یہی مشورہ سے ملے پاتے تھے۔ اور (ظاہر ہے کہ) ان فیصلوں میں حالات کے مطابق حکم و اضافہ اور تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا۔ یہ جو ہیں کتب احادیث میں، ایک ہی مسئلہ کے مختلف روایات ملتی ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ درحقیقت مختلف اوقات میں ملے کردہ مختلف فیصلے ہیں۔ ہماری کتب روایات میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ ان میں فیصلے تو دیئے گئے ہیں لیکن ان احوال و ظروف کی تفصیل و تصریح نہیں دی گئی جن کی روشنی میں وہ فیصلے دیئے گئے تھے۔ قانون دان حضرات سے یہ حقیقت بوجہ شبہ نہیں کہ کسی فیصلے کے صحیح مفہوم و منطوق تک پہنچنے کے لئے (CASE LAW) کا سامنے ہونا کتنا ضروری ہے۔ اُمت میں جو اس قدر فرقے پائے جاتے ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک گروہ نے رسول اللہ کے کسی ایک فیصلہ پر عمل شروع کر دیا اور دوسرے نے کسی دوسرے فیصلے پر۔ اور دونوں نے اپنی اپنی جگہ سمجھ لیا کہ جس فیصلہ پر وہ عمل پیرا ہے، وہ ابدی قانون شریعت ہے، حالانکہ ان میں ابدی قانون کوئی بھی نہ تھا۔ یہ، مختلف احوال و کوائف کے ماتحت، صادر فرمودہ فیصلے تھے، جو حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک غلط مثال پر غور فرمائیے۔

قرآن کریم کی روش سے، زمین (یا وسائل پیداوار) پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ اُمت کی مشرک تخیل میں رہتی ہے، اور مملکت اس کا انتظام کرتی ہے تاکہ وہ افراد و معاشرہ کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے۔ رسول اللہ کے زمانہ میں مختلف اوقات میں مختلف اراضیات مملکت کے قبضہ میں آئیں۔ آپ نے مفاد عامہ کے پیش نظر، حالات کے تقاضے کے مطابق، ان کے متعلق مختلف انتظامات فرمائے۔ مثلاً خیبر فتح ہونے پر، زمین کو مملکت کی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس میں سے کچھ حصہ فرجیوں کو دے دیا اور بقیہ حصہ اصل باشندوں کے پاس رہنے دیا اور پیداوار میں حکومت اور اصل باشندوں، دونوں کو شریک کر لیا۔ وادی القریٰ کی کل زمین آپ نے اصل باشندوں کے پاس رہنے دی۔ اس کے برعکس، بنو نضیر، جو ہانئدار اور زمین چھوڑ گئے، آپ نے اُسے مملکت کے زیر انتظام، مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ مکہ فتح ہونے کے بعد تمام زمینیں خلافت کے زیر اہتمام اصل باشندوں کے پاس رہنے دیں۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کا یہ اصول (کہ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی، وہ مملکت کی تحویل میں رہے گی) تو اپنی جگہ پر اُٹل اور خیر متبدل رہا، لیکن زمین کا انتظام، موقع اور محل کے لحاظ سے بدلا جاتا رہا۔ (آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ جب عراق کی زمینیں فتح ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے ان کا کیا انتظام کیا)۔

اسی طرح جراثیم کی سزا کے سلسلہ میں بھی آپ نے مجرموں کے احوال و کوائف اور ان کی ذہنی سطح اور نفسیاتی کیفیت کے پیش نظر مختلف اوقات میں مختلف فیصلے صادر فرمائے۔ مثلاً ایک شخص نے شراب پی اور اپنے آپ کو خود ہی سزا کے لئے پیش کر دیا۔ آپ نے اس کی حالت کا جائزہ لیا اور فرمایا کہ



کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں پڑھی ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ جاؤ خدا نے تمہارا جرم معاف کر دیا ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص نے ہمیشہ کے لئے شراب نوشی سے توبہ کر لی۔ یہ تھا اس میں اصلاح کا امکان جس کے پیش نظر حضورؐ نے اس پر تعزیر وارد نہیں کی۔ ایک واقعہ میں اصل مجرم کی جگہ غیر مجرم پکڑا گیا اور قانون کے مطابق حضورؐ نے اس کو سزا کا حکم بھی سنادیا۔ لیکن بعد میں اصل مجرم نے آکر کہا کہ مجرم وہ نہیں۔ میں ہوں۔ اس پر آپ نے دو غول کی سزا معاف فرمادی۔ پہلے کی اس لئے کہ وہ مجرم نہیں تھا، اور دوسرے کی یہ کہہ کر کہ اس نے ایک بے گناہ کو سزا سے بچانے کے لئے، اپنے آپ کو خود ہی سزا کے لئے پیش کر دیا۔ اس سے اس نے ایسی بلندی کردار کا ثبوت دیا ہے کہ وہ معافی کا مستحق ہو گیا ہے۔ (نسائی) اس قسم کی اکثر مثالیں حضورؐ کے صادر فرمودہ فیصلوں میں ملتی ہیں۔ ایسے فیصلے کرتے وقت قوم کے عمومی جذبات کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا تو حطیم اس کے اندر شامل تھا۔ جب قریش نے اس کی تعمیر نو کی تو حطیم باہر نکال دیا۔ رسول اللہؐ چاہتے تھے کہ حطیم کو کعبہ کے اندر شامل کر کے اسے ابراہیمؑ کی خطوط کے مطابق تعمیر کر دیا جائے۔ لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ:-

اگر تیری قوم نئی نئی کفر سے اسلام کی طرف نہ آئی ہوتی تو میں کعبہ کو منہدم کر کے اس میں ابراہیمؑ پر اس کی تعمیر کرتا۔ اور حطیم کو اس کے اندر شامل کر لیتا۔  
(مسلم باب نقض الکعبہ)

ان مثالوں سے واضح ہے کہ دین کے اصول و اقدار کو ہمیشہ غیر متبدل رکھتے تھے لیکن ان کی روشنی میں مختلف امور کے فیصلے کرتے وقت مصالح عمومی، افراد کے احوال و کوائف اور قوم کے امیال و خواہشات کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح، مختلف اوقات میں طریق کار کا بھی اختلاف ہوتا تھا۔ مثلاً عدل، قرآن کا بنیادی اصول ہے، جس میں کسی صورت میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن عدل کو بروئے کار لانے کا طریقہ مختلف اوقات میں مختلف ہوگا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:-

شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں میں عدل و انصاف کا قیام ہے جس طریق کے ذریعے عدل و انصاف قائم کیا جائے گا، وہی دین ہوگا۔ اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا۔  
(الطریق الحکمیہ)

لہذا، دین کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو طریق کار اختیار کیا جائے، اس کے لئے قرآن کی سند یا رسول اللہؐ سے ثبوت ضروری نہیں۔ طریق کار حالات اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلنے رہیں گے۔ شرط یہ ہے کہ وہ طریق کار قرآنی اقدار سے نہ ٹکرائے۔ خود حضورؐ نے مختلف اوقات میں مختلف طریق کار اختیار فرمائے تھے۔

## خلافت راشدہ

حضور نبی اکرمؐ نے اسلامی مملکت کو قائم فرمایا اور عملاً بتا دیا کہ اس میں ثبات و تغیر کا امتزاج کس طرح سے ہوگا۔ اس کے بعد حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے اور مملکت کا نظام خلافت راشدہ کی تحویل میں آ گیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا زمانہ خلافت بہت مختصر تھا۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مملکت کی حدود بہت پھیل گئیں۔ نئی نئی قومیں حلقہ بگوش اسلام ہوئیں۔ مختلف تہذیبوں کے ساتھ واسطہ پڑا۔ مندرجہ انداز کے تمدن سامنے آئے۔ کاروبار مملکت وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اس سے نئے مسائل ابھرے جن کا حل کرنا مملکت کا فریضہ تھا۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ :-

بے شک خدائے بزرگ و برتر، حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کیلئے

(کتاب المیزان)

نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ ان نئے مسائل سے نمٹنے کے لئے ضروری تھا کہ نئے نئے فیصلے کئے جاتے۔ جو معاملات پہلی بار سامنے آئے اور ان کے متعلق جو فیصلے کئے گئے، انہیں مؤرخین نے "اولیاتِ عمرؓ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور ان کی فہرست طویل ہے۔ جن امور کے فیصلے عہد رسالت مآبؐ اور خلافت صدیقیؓ کے زمانے میں ہوئے تھے، حضرت عمرؓ نے بدلے ہوئے حالات کے مطابق، ان میں بھی تغیر و تبدل کیا۔ یہی وہ گوشہ ہے جو ہمارے موضوع بحث نظر کی رو سے قابلِ غور ہے۔ ایسے فیصلوں کی تعداد بھی کثیر ہے لیکن قلتِ وقت کی بنا پر، ان میں سے چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس وقت میرا مقصود تاریخی استنباط نہیں۔ مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ اسلامی نظام میں ناقابلِ تغیر، قرآن کریم کے اصول و اقدار ہوتے ہیں، اور ان کی روشنی میں جو فیصلے کئے جاتے ہیں، وہ حالات کے تغیر سے بدلے رہتے ہیں۔ نیز یہ کہ خود قرآن کریم کے احکام کا نفاذ بھی موقع اور محل کی رعایت سے، مناسب شرائط سے، مشروط ہوتا ہے۔ وہ مثالیں جن کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے :-

## حضرت عمرؓ کے فیصلے

(۱) قرآن کریم میں مسلمان مردوں کو، اہل کتاب کی عورتوں سے

شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ عہد رسالت مآبؐ اور خلافت

صدیقیؓ میں اس کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اسے روک دیا کہ مجھے

خطرہ ہے کہ یہ عورتیں امت میں فتنہ برپا کرنے کا موجب بن جائیں گی۔

(احکام القرآن)۔ (ابو بکر جصاص)۔ (نیز کتاب الآثار، امام محمد)

(۲) اسی طرح، قرآن کریم میں اہل کتاب کے طعام کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے

حکم دیا کہ مسلمانوں کے شہروں سے یہودیوں اور عیسائیوں کے قبضہ خانے ہٹا دیئے جائیں اور

اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ہم اپنے انتظام کی بنا پر ان سے مستغنی ہو گئے ہیں۔ (المداونہ، کتاب الذبائح)

(۳)۔ قرآن کریم میں صدقات کے مال میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا گیا ہے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ جو لوگ، اپنے سابقہ معاشرہ سے کٹ کر، اسلامی معاشرہ میں داخل ہوں اور اس سے انہیں مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے، تو اس مدد سے ان کی امداد کی جائے۔ رسول اللہ اور حضرت ابوبکر کے زمانے میں اس پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن حضرت فاروق اعظمؓ نے یہ کہہ کر اسے بند کر دیا کہ اب ملک میں ایسی خوشحالی پیدا ہو چکی ہے کہ کسی کو مالی مشکلات سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ اس لئے مؤلفۃ القلوب کیلئے الگ امداد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ (احکام القرآن - جصاص)

(۴) رسول اللہ کے زمانے میں شرابی کو معمولی سی سزا دی جاتی تھی جس سے وہ اپنے کئے پر نادم ہو جاتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کی سزا چالیس کوڑے مقرر کی اور حضرت عمرؓ نے اسے بڑھا کر اسی کوڑے کر دیا۔ (سنن الکبریٰ)

(۵) قرآن کریم کی رو سے، سرقہ (چوری) کی سزا "قطع یہ" ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے قلعہ کے زمانے میں اس سزا کو موقوف کر دیا۔ عام حالات میں بھی اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو کر اضطراری حالت میں چوری کر لیتا تو اسے سزا نہ دی جاتی۔ ایک شخص کے غلاموں نے کسی کا اونٹ چرا کر کھا لیا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ان کا مالک انہیں بھوکا رکھتا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے مجبور ہو کر اقام کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے چوروں کو تو معاف کر دیا اور اونٹ کے مالک کو، ان غلاموں کے مالک سے یہ کہہ کر تاوان دلایا کہ اس جرم کے مرتکب درحقیقت تم ہو جس نے ان غلاموں کو بھوکے رکھ کر انہیں چوری کرنے پر مجبور کر دیا۔ (آپ کا یہ فیصلہ، اسلامی نظام معیشت میں بڑی اصولی اہمیت رکھتا ہے)۔

(۶) رسول اللہؐ کا فیصلہ تھا کہ کسی مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لیا نہیں جاسکتا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں، ایک شخص نے شکایت کی کہ اس کی زمین تک پانی اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ پانی کی نالی فلاں شخص کی زمین سے گزرے۔ اور وہ اس کے لئے رضامند نہیں ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ وہ شخص اسے پانی لے جانے دے اور اس کے راستے میں بالکل مزاحم نہ ہو۔ (الخروج - یحییٰ)

(۷) اس سلسلہ میں عہد فاروقی کا سب سے اہم فیصلہ عراق اور شام کی مفتوحہ زمینوں کے متعلق ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے، زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت جائز نہیں۔ اسے مملکت کی تحویل میں رہنا چاہیے۔ رسول اللہ کے زمانے میں اراضیات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مسلمانوں کے قبضے میں آتے تھے جنہیں (مال غنیمت کے طور پر) بالعموم فوجیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، اگرچہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ان کے متعلق رسول اللہؐ نے بھی مختلف انتظامی طریق اختیار فرمائے تھے۔ جب عراق اور

حد کوڑے کسی قسم کے ہوتے تھے اس کے متعلق طلوع اسلام بابت ستمبر ۱۹۷۷ء ملاحظہ فرمائیے۔



شام کے علاقے فتح پور سے، تو ایک تودہ رقبے بڑے وسیع و عریض تھے، اور دوسرے اولوں کی زمینیں بڑی زرخیز تھیں۔ صحابہؓ کی اکثریت کی رائے تھی کہ انہیں، مال غنیمت کے طور پر فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ ان سے متفق نہیں تھے۔ یہ معاملہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا کہ اسے اعیانِ اُمت کی عام میٹنگ میں پیش کرنا پڑا۔ اس میں مختلف حضرات نے جو تقاریر کیں، تاریخ کے اوراق نے انہیں اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ اور وہ اس موضوع کے سمجھنے میں بڑی مفید ہیں۔ ان کے جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا:-

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس زمین کو آپ لوگوں میں تقسیم کر دوں اور بعد کے لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ رہے۔ کیا آپ کا یہ مقصد ہے کہ اس کی آمدنی ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے، اور نسل بعد نسل اسی میں منتقل ہوتی رہے؟ اگر میں نے ایسا کر دیا تو سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی۔ بیواؤں اور محتاجوں کی کفالت کہاں سے ہوگی۔ مجھے اس کا بھی خدشہ ہے کہ لوگ پانی کی باریوں پر بھی فساد کرنے لگ جائیں گے۔

(لہذا، میں ان زمینوں کو مملکت کی تحویل میں رکھنا چاہتا ہوں۔ افراد میں تقسیم نہیں کرنا چاہتا)۔

پہلی میٹنگ میں فیصلہ نہ ہو سکا تو اسے دوسری میٹنگ میں زیر بحث لایا گیا۔ اس میں بھی بعض حضرات نے اپنے موقف کی تائید میں یہ دلیل پیش کی کہ رسول اللہؐ نے اراضیات کو فوجیوں میں تقسیم فرمایا تھا اس لئے ہمیں بھی ویسے ہی کرنا چاہیے۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے بڑی مبسوط اور مدلل تقریر فرمائی۔ جس میں، علاوہ دیگر دلائل و شواہد، قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال فرمایا جس میں کہا گیا ہے کہ مال فتنے میں مہاجرین اور انصار کا بھی حصہ ہے۔ وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ - (۵۹) اور ان کے بعد آنے والے لوگوں کا بھی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر زمین کو افراد کی ذاتی ملکیت میں دے دیا جائے تو اس میں آنے والی نسلوں کا حصہ نہیں رہ سکتا اس لئے اسے مملکت کی تحویل ہی میں رہنا چاہیے۔ یہ تقریر ایسی بصیرت افروز اور حقیقت کشا تھی کہ تمام صحابہؓ نے اس سے اتفاق کیا اور زمینیں مملکت کی تحویل میں رہیں۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے، میری کتاب - شاہکار رسالتؐ - باب معاشی نظام)۔

ان تاریخی شواہد کے پیش کرنے سے میرا مقصد اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ اگر حالات متقاضی ہوں تو اسلامی نظام کی رو سے، ایک اسلامی حکومت کے فیصلے، بعد میں آنے والی حکومت تبدیل بھی کر سکتی ہے اور ان میں حکم و امانہ بھی، بشرطیکہ یہ تبدیلیاں قرآن کے غیر متبدل اصول و اقدار سے ٹکرائیں نہیں۔

خلافت راشدہ کے بعد، اسلامی حکومت کا یہ نقشہ باقی نہ رہا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی نظام کا وہ اصول جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے، ارباب فکر و نظر کے سامنے نمایاں طور پر رہا۔ اس ضمن میں

ہمارے سامنے، ملت اسلامیہ کے متقدم اعظم، امام ابوحنیفہؒ کی مثال متمیز طور پر آتی ہے۔ جہاں تک اسلامی

قوانین و ضوابط پر تفقہ و تدبیر کا تعلق ہے، امام صاحب کا مقام بہت بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فکر و تدبیر کی منفرد صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ کا مسلک یہ تھا کہ دین کی اساس و بنیاد، قرآن کریم اور فکر انسانی پر ہے۔ جو کچھ قرآن کریم میں کہا گیا ہے، اس کی روشنی میں، اپنے زمانے کے مسائل کا حل، غور و تدبیر سے خود دریافت کرنا چاہئے۔ اسے وہ اجتہاد یا تفسیر سے تعبیر کرتے تھے۔ جو لوگ آپ سے متفق نہیں تھے، وہ آپ کے اس مسلک کو قیاس قرار دے کر اس کی مذمت کرتے تھے۔ اس حد تک مذمت کہ وہ آپ سے کہتے تھے کہ: **أَوَّلُ مَنْ قَاسَ ابْلِيسُ**۔ فلا تفسس۔ سب سے پہلے جس نے قیاس سے کام لیا تھا وہ ابلیس تھا۔ لہذا، تم ایسا نہ کرو۔ اس کے جواب میں امام صاحب فرماتے تھے کہ

میں جو کچھ کہتا ہوں وہ قیاس نہیں۔ وہ تو قرآن کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ہے کہ **مَا خَلَقْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ**۔ (سورہ بقرہ) ہم نے کتاب میں کسی بات کو بھی چھوڑا نہیں۔ لہذا، جو کچھ میں کہتا ہوں وہ ان لوگوں کے نزدیک قیاس ہے جنہیں خدا نے فہم قرآن کی نعمت سے نہیں نوازا۔ (کتاب میزان)

امام صاحب اپنی عقل و فکر کی روشنی میں، قرآن کریم سے استنباط مسائل کرتے تھے، اور سابقہ ادوار کے فیصلوں کو، **نظائر (PRECEDENTS)** سے تعبیر کرتے تھے جن سے، معاملات کا فیصلہ کرنے میں، استفادہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ انہیں ہر زمانے میں من و عن ناذر کیا جائے۔ ان کے نزدیک، عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے فیصلوں کی بھی یہی حیثیت تھی۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں، بہت سی مثالیں درج کی ہیں جن سے امام صاحب کا مسلک واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً یوسف بن اسباط سے ابوصالح الفراء نے یہ قول نقل کیا ہے کہ: **ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبی صلعم مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا (یعنی دونوں ہم عصر ہوتے) تو آپ میرے اکثر احوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔** (بغدادی - جلد ۱۳ - صفحہ ۲۹)

دوسرے مقام پر ہے۔

محمود بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام اعظمؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہؐ مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابوصالح کہ میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے

اکثر نبی کی حدیثیں آئیں اور وہ ان کی مخالفت کرتے۔ (ایضاً - ص ۲۸۷)

آپ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بعد آدمی نے لکھا ہے کہ ابو حنیفہ نے بیان کیا۔ کہ میں ایک روز ابو حنیفہ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا جھوٹہ چرایا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابو حنیفہ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم بتو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایچی چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلوا ری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کر پیچھے ورنہ امیر کے ہاں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابو حنیفہ نے پھر بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گذر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔ (ایضاً - ص ۲۹)

امام صاحب کے قول کا آخری ٹکڑا قابل غور ہے۔ اور اسی کی خاطر میں نے یہ اقتباس بھی پیش کیا ہے۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ مجھے شک ہے کہ رسول اللہ نے ایسا فیصلہ دیا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ نے ایسا ہی ارشاد فرمایا ہوگا۔ لیکن وہ فیصلہ اس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں، اس لئے اب فیصلہ موجودہ حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

امام ابو حنیفہ کا یہی مسلک تھا جس پر علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں بڑا بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ پہلے شاہ ولی اللہ

### علامہ اقبالؒ کا تبصرہ

کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ

پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور ذخیرہ استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجا ئے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر مبنی و معنی نافذ نہیں کیا جاسکتا۔

(خطبات - تشکیل جدید - چھٹا خطبہ)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں :-

غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہ نے، جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے، اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے



کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار حدیث پر کیوں نہیں رکھا۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

ان حالات کی روشنی میں، میں سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرز عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور آج اگر کوئی وسیع النظر مفسر یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرز عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرز عمل کے ہم آہنگ ہو گا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔ (خطبات - ص ۱۶۳-۱۶۴)

یہ تھا امام ابوحنیفہؒ کا مسلک جو عہد رسالتؐ اور خلافت راشدہ میں رائج مسلک کے عین مطابق تھا۔ لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تحریک ابھری جس کی رو سے یہ عقیدہ عام کیا گیا کہ جو کچھ پہلے زمانے میں ہو چکا ہے،

## اس کے خلاف تحریک

اس میں سرِ مو تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ وہ عین دین ہے اور اس میں تغیر و تبدل الحاد و بدلہ دینی جو کچھ سوچا جانا تھا، سوچا جا چکا۔ جو کچھ سمجھا جانا تھا، سمجھا جا چکا۔ اب غور و فکر (جسے اجتہاد کہتے ہیں) کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ شریعت کے جو احکام عہد رسالتؐ میں نافذ ہو چکے تھے، وہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ایک گروہ نے اس میں اتنا اضافہ کیا کہ ان میں وہ احکام بھی شامل ہیں جو خلافت راشدہ کے زمانے میں نافذ العمل تھے۔ چنانچہ ان احکام کے مجموعے مرتب کئے گئے اور وہ اُمت کے لئے دائماً، ناقابلِ تغیر و تبدل، ضابطہ قوانین قرار پائے گئے۔ اس تحریک کے پُرچوش محرک امام شافعیؒ نظر آتے ہیں۔ انہی نے یہ عقیدہ عام کیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں — ایک وحی متلوٰ اور دوسری وحی غیر متلوٰ — یہ دونوں، خدا کی طرف سے، بواسطہ حضرت جبریل نازل ہوئی تھیں۔ وحی متلوٰ قرآن کے اندر درج کر دی گئی اور وحی غیر متلوٰ، احادیث کہلائی۔ لہذا رسول اللہؐ کو خدا کی طرف سے قرآن ہی نہیں دیا گیا۔ مثلاً محدث قرآن کے ساتھ قرآن کی مثل، دوسری وحی بھی دی گئی جو احادیث میں منضبط ہے۔ اس عقیدہ کی اہمیت کے پیش نظر احادیث کے مختلف مجموعے مرتب کئے گئے، حالانکہ رسول اللہؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب فرما کر اُمت کو دیا تھا اور نہ ہی خلافت راشدہ میں ایسا ہوا تھا۔ احادیث کا پہلا مبسوط مجموعہ، جسے صحیح ترین مجموعہ کہا جاتا ہے، امام بخاریؒ نے تیسری صدی ہجری میں مرتب کیا تھا۔ اور وہ بھی بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے، زبانی روایات کی بنا پر احادیث کے تمام مجموعے اسی طرح مرتب ہوئے تھے۔ اس کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ حدیث، قرآن پر قاضی ہے۔ یعنی اگر قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو فیصلہ حدیث کی رو سے کیا جائے گا۔ یہ کہ قرآن کی رو سے — اور پھر ایک قدم اور آگے بڑھے تو یہ عقیدہ عام کیا گیا کہ حدیث، قرآن کو منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

حدیث کی اس پوزیشن کی رو سے، جو کچھ احادیث کے مختلف مجموعوں میں آگیا اور جسے صحیح قرار دے دیا گیا، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل قرار پا گیا۔ یہی عقیدہ آج تک چلا آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک کا پہلا مدافع، امام ابوحنیفہؒ کو قرار پانا تھا جنہوں نے یہ مسلک پیش کیا تھا کہ وہ فیصلے، غیر متبدل احکام شریعت نہیں تھے۔ چنانچہ ان حضرات کی طرف سے امام صاحبؒ کے خلاف وہ کچھ کہا گیا جسے دہرائے ہوئے ہماری روج پر کبکپی چھایا جاتی ہے۔ امام مالکؒ بن انس کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کا فتہ اس امت کے لئے (معاذ اللہ) ابلتس کے فتہ سے کم نہیں۔ عبد الرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ میں نے دقار کے فتہ کے بعد اسلام میں کسی فتہ کو ابوحنیفہؒ کے فتہ سے بڑا نہیں دیکھا۔ جب امام صاحبؒ کا انتقال ہوا تو امام اوزاعیؒ نے کہا کہ خدا کا شکر ہے۔ وہ اسلام کے ایک ایک دستہ کو ٹوڑ رہا تھا۔ فزاری کہتے ہیں کہ میں نے سفیانؒ اور اوزاعیؒ دونوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اسلام میں (معاذ اللہ) ابوحنیفہؒ سے زیادہ بد بخت پیدا نہیں ہوا۔ امام شافعیؒ نے بدترین کالفا استعمال کیا ہے۔ ابراہیمؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ابوحنیفہؒ کے کچھ مسائل امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے پیش کئے تو وہ تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوحنیفہؒ ایک نیا اسلام تصنیف کر رہے ہیں۔ ان بزرگوں کے اس قسم کے فتادی کی وجہ سے، امام صاحبؒ کے خلاف جذبہ مسافرت اس حد تک شدید ہو گیا کہ ابو عبیدہؒ کہتے ہیں کہ میں اسود ابن سالم کے ساتھ رصافہ کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں کسی مسئلہ کا تذکرہ آگیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ابوحنیفہؒ ایسا کہتے ہیں، تو اسود نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ تو مسجد میں ابوحنیفہؒ کا تذکرہ کرتا ہے۔ مسجد میں ابوحنیفہؒ کا نام لینے کے جرم میں وہ مجھ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ مرتے دم تک مجھ سے کلام نہیں کیا۔ یہ تمام تقریرات خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد میں موجود ہیں اور ادارہ طابع اسلام کی طرہ سے شائع کردہ کتاب، مقام حدیث میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

امام اعظمؒ کے مسلک کے متبعین نے کچھ وقت تک تو اس مخالفت کا مقابلہ کیا لیکن چونکہ مخالفین، لوگوں کو یہ کہہ کر بخٹھرائے تھے کہ یہ لوگ منکرین حدیث اور منکرین شان رسالت ہیں، اس لئے انہیں اس سیلاب بے پناہ کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا۔ اور اس عقیدہ کو تسلیم کر لیا کہ جو احکام احادیث میں ہیں، وہ ناقابل تغیر ہیں، اور پھر اپنی فقہ کے فیصلوں کی تائید، احادیث سے شروع کر دی۔ لوں خود فقہ حنفی کے فیصلے غیر متبدل قرار پا گئے اور ان پر اجتہاد کے راستے بند ہونے شروع ہو گئے۔

رفتہ رفتہ، یہ اس عقیدہ تک پہنچ گئے کہ (احادیث تو ایک طرف) جو کچھ ائمہ فقہ کہہ چکے ہیں وہ بھی قیامت تک ناقابل

تغیر و تبدل ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے ایک پیشوا اور مسلم امام، ابوالحسن عبید اللہ انکریؒ کا قول ہے کہ ”ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماقول ہے یا منسوخ۔ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ یا تو ماقول یا منسوخ ہے۔“ (تاریخ فقہ اسلامی - علامہ خضریٰ - ص ۲۲۷) ظاہر ہے

کہ ان حالات میں اجتہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اجتہاد تو ایک طرف، یہ حضرات اب کسی مزید تحقیق و تفتیش کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ چند سال اوپر کا ذکر ہے، (جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی نے ایک استفسار کے جواب میں کہا تھا کہ

یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمہ ہدی کی تحقیقات کا مجموعہ ہے۔ لہذا اگر تحقیقات اسلامی سے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنفیج شدہ موجود ہیں، تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے اور اگر تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر اُمت محمدیہ کا اجماع ہے۔ (بحوالہ، ایشیا۔ ہر اگست ۱۹۲۸ء)

حالانکہ ان کے سامنے، خود امام اعظمؒ کا یہ مسلک موجود ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کو بھی ناقابل تغیر و تبدیل قرار نہیں دیتے تھے۔ مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتوے دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں، کیا یہ سب حق ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا۔ بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو۔ اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفر فرماتے ہیں کہ ہم امام ابو حنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام صاحبؒ فیصلے فرماتے ہم انہیں لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک دن امام صاحبؒ نے ابو یوسفؒ سے فرمایا کہ یعقوب! تیرا ناس ہو۔ جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے، اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری رائے کچھ ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو نعیم کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہؒ کو ابو یوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو۔ کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں اپنے اجتہاد میں خطا کار ہوں یا مصیب۔ (خطیب بغدادی۔ جلد ۱۵۔ ص ۲۵۲) یہ تھا امام صاحبؒ کا مسلک خود اپنی فقہ کے متعلق یہی وجہ ہے کہ جسے فقہ حنفی کہتے ہیں، اس میں امام صاحبؒ کی کوئی کتاب شامل نہیں۔ انہوں نے فقہ کی کوئی تصنیف اپنے پیچھے نہیں چھوڑی تھی۔

بہر حال، میں کہہ رہا تھا کہ جس فقہ کو خود اس فقہ کے بانی، امام ابو حنیفہؒ ناقابل تغیر قرار نہیں دیتے تھے، ان کے نام لیواؤں نے اسے قیامت تک کے لئے بغیر متبدل قرار دے لیا۔ اور اس طرح اُمت پر اجتہاد کے تمام دروازے مستقلاً بند ہو گئے۔ یہ کیفیت صدیوں سے مسلسل چل آ رہی ہے۔

**عقل و فکر مفلوج ہو گئے** نتیجہ اس کا یہ کہ عقل و فکر کی تمام صلاحیتیں، جنہیں قرآن کریم نے وجہ شرف انسانیت قرار دیا ہے، پیچھے

شل اور پھر رستہ رستہ مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ مسلمان اصولی طور پر دو فرقوں میں منقسم ہیں۔ ایک اہل حدیث اور دوسرے اہل فقہ۔ اہل حدیث کے نزدیک، علم دین سے مراد فقط اتنا رہ گیا ہے کہ جو بات سامنے آئے، یہ بتا دیا جائے کہ اس کے بارے میں کتب روایات میں کیا آیا ہے۔ اور اہل فقہ کے



نزدیک یہ کہ اس کے متعلق ائمہ فقہ نے کیا ارشاد فرمایا ہے۔ جو شخص جتنے زیادہ حوالے پیش کر سکے وہ اتنا ہی بڑا عالم تصور کیا جائے گا۔ اسلامی زندگی سے مقصد دیر قرار پایا کہ قدم بقدم اسلاف کے راستے پر چلا جائے۔ کسی نے اس سے سرواخراف یا تجاوز کیا اور ارباب شریعت کی بارگاہوں سے کفر والحاد کے فتوؤں کی بوجھار شروع ہو گئی۔ اسلاف کی تقلید میں کس درجہ شدت اختیار کی گئی؟ اس کا اندازہ ایک تاریخی واقعہ سے لگائیے۔ اموی دور حکومت میں، دمشق میں سب سے بڑی جامع مسجد تعمیر ہوئی اور اس کے بعد دیگر مساجد اس کے رخ پر بنائی گئیں۔ کچھ عرصہ بعد، مسلمان انجیڑوں نے حسابی قاعدہ کی رو سے دیکھا کہ جامع دمشق کا رخ کعبہ کی صحیح سمت نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس مسجد میں صفوں کا رخ بدل دیا جائے اور آئندہ مساجد صحیح سمت کے مطابق تعمیر کی جائیں۔ مسئلہ ارباب شریعت کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے لمبی چوڑی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ جامع دمشق کا رخ جانب قبلہ نہیں تو اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے اسلاف نے جس قدر نمازیں پڑھیں وہ درست نہیں تھیں۔ ہم چند انجیڑوں کی بات پر، اپنے اسلاف کی شان میں اس قدر سوداوی کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان مساجد کا رخ تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ صحیح وہی ہے جو اسلاف کرتے چلے آئے ہیں اور ہم انہی کے نقش قدم پر چلیں گے۔ محل خیر فی اتباع السلف۔

## تقلید کی شدت

نیکی اور بھلائی بہ تمام و کمال اسلاف کے اتباع میں ہے۔ (بحوالہ شافعی) چنانچہ مساجد کا رخ نہیں بدلا گیا۔ اور یہ مسلک اور عقیدہ اس قوم کا ہے جس کا خدا، کفار کے متعلق کہتا ہے کہ جب ان کے سامنے حقائق پیش کئے جائیں تو بجا آئے اس کے کہ یہ ان پر عقل و فکر کی روشنی میں غور کریں اور دلائل و براہین کی روش سے ان کے متعلق بحث و تمحیص کریں، یہ اتنا کہہ کر ان حقائق سے انکار کر دیتے ہیں کہ: **إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ مَهْتَدُونَ۔** (۲۴) ہم نے اپنے آباؤ و اجداد کو ایک راستے پر چلتے پایا اور ہم انہیں کے نقش قدم پر چلتے جائیں گے۔ اس لئے ہم کوئی ایسی بات سننا بھی نہیں چاہتے جو ہمیں اسلاف کے راستے سے دوسری طرف لے جانے کا موجب بنے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ **وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا غُلَامًا كَذِبًا۔** جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی پیروی کرو تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں! ہم تو اس راستے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے پایا ہے۔ اس پر قرآن کہتا ہے کہ: **أَوَلَوْ كَانُوا الشَّيْطَانِ بِبُذُنٍ خَسَافٍ أَوْ إِلَىٰ عَذَابٍ أَلِيمٍ۔** (۲۵) خواہ شیطان انہیں جہنم کی دعوت ہی کیوں نہ دے، یہ اسی راستے پر چلتے جائیں گے۔

## تقلید اور قرآن

اس کے جواب میں ہمارے ارباب شریعت کہہ دیا کرتے ہیں کہ کفار کے اسلاف چونکہ غلط راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز تھی۔ ہمارے اسلاف صحیح راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ہمارے ارباب شریعت کہہ دیا کرتے ہیں کہ کفار کے اسلاف چونکہ غلط راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز تھی۔ ہمارے اسلاف صحیح راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز نہیں ہے۔

اس کے جواب میں ہمارے ارباب شریعت کہہ دیا کرتے ہیں کہ کفار کے اسلاف چونکہ غلط راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز تھی۔ ہمارے اسلاف صحیح راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز نہیں ہے۔

نہیں قرار پاسکتی۔ ایسا کہتے وقت وہ اس علت پر غور نہیں کرتے جس کی بنا پر تقلید اسلام سے روکا گیا ہے، وہ علت یہ ہے کہ خدا جب مَا آتَزَلَّ اللّٰہُ کے اتباع کا حکم دیتا ہے تو اس لئے کہ مَا آتَزَلَّ اللّٰہُ کی رہنمائی غیر متبدل ہونے کی وجہ سے ہر زمانے میں واجب الاتباع ہوتی ہے، اور اسلام کا مسلک، خواہ ان کے زمانے میں صحیح بھی کیوں نہ ہو، ہر زمانے میں اتباع کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے ابدی پیروی کتاب اللہ کی ہوگی، نہ کہ کسی سابقہ زمانے کی روشنی کی حضور نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد گرامی اس باب میں خندیل ہدایت ہے، آپؐ نے فرمایا:-

الناس اشبه بزمانهم من اسلامهم۔ (ملاحظہ۔ البیان والتبيين)

لوگ، اپنے اسلام کے مقابلہ میں، اپنے زمانے کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔

دین میں امن و جمود و تقلید کی بنیادی وجہ یہ بھی ہوتی کہ ہماری حکومتیں اسلامی نہ رہیں۔ اس سے زندگی میں ثنویت (DUALISM) پیدا ہوگئی۔ دنیاوی اور حکومت نے اپنے ذمے لے لئے اور شرعی امور (جن سے مراد شخصی قوانین تھے)۔

### جمود کی دوسری وجہ

ارباب شریعت کے حیض اقتدار میں چلے گئے۔ سلطنتیں اپنے دائرہ اختیار میں، قوانین میں رد و بدل کرتی رہیں۔ لیکن ارباب شریعت نے اسی میں عاقبت دیکھی کہ جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے وہ اسی کی پابندی کرتے رہیں۔ اس کے لئے عقیدہ یہ وضع کر دیا گیا کہ ہر آنے والا زمانہ، سابقہ زمانے کے مقابلے میں، برتر و تقویٰ ہی میں نہیں، علم و بصیرت میں بھی پست تر اور خراب تر ہوتا ہے۔ علامہ اسلام

### ماضی درخشاں حال تاریک

جیرا چوری سنا کر تے تھے کہ اٹھائے حج میں انہوں نے دیکھا کہ مکہ کا ایک تجرہ نامیائی، پکار پکار کر کہا کرتا کہ آج کی روٹی دو پیسے ہیں۔ کل کی (باسی) روٹی ایک آنہ ہیں۔ انہوں نے ایک دن اس سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ تم آج کی تازہ روٹی دو پیسے میں بیچتے ہو اور کل کی باسی ایک آنہ ہیں۔ کہتے لگا کہ کل کی روٹی، رسول اللہؐ کے زمانہ سے ایک دن قریب تر ہے۔ اس لئے قیمت میں گراں تر۔ یہ ذہنیت اگر انفرادی جذبات کی حد تک رہتی تو پھر بھی اس میں چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن اس نے اصول دین کی شکل اختیار کر ل جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امت کو اپنا ماضی روکش دکھائی دیا۔ حال تاریک، اور مستقبل تاریک تر۔

علامہ اقبالؒ نے جب مسلمانوں کی اس صورت حال پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کی بنیادی وجہ، مسلمانوں کی کسی مملکت بھی اسلامی نہ ہونا ہے۔ اگر کسی ایسی مملکت کا قیام عمل میں آجائے جس میں صحیح قرآنی نظام نافذ ہو، تو اسلام از سر نو زندہ ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک، اس اسلام کا تصور کیا تھا جسے وہ اس طرح زندہ کرنا چاہتے تھے، اس کے متعلق انہوں نے اپنے خطابات، تشکیلیں جدید کے چھٹے خطبہ میں

### علامہ اقبالؒ کا تصور اسلام

تفصیل سے بحث کی ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ اسلامی قانون شریعت میں اصولی اتقان۔ اس میں انہوں نے کہا ہے:-





ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلام حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

علامہ اقبالؒ تو حصول پاکستان سے پہلے ہی عالم بالا کو تشریف لے گئے اور تاثرِ اعظمؒ یوں کہتے کہ ہنوز آئیں پاکستان کی پہلی اینٹ بھی رکھتے نہ پائے تھے کہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد، یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کی ذمہ داری ان حضرات نے اپنے ہاتھ میں لے لی، جن کے سامنے اسلام کا وہی جامد تصور تھا جس کی جگہ حقیقی اسلام کے احیاء کے لئے پاکستان چل گیا تھا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں بیان کیا ہے، جب میئر انکوٹری کمیٹی کے سامنے حضرات علامہ کرام پیش ہوئے ہیں تو انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان میں نہ قانون سازی کی ضرورت ہے اور نہ ہی مجاہدین قانون ساز کی حاجت۔ ہمارے پاس مکمل ضابطہ قوانین بنا بنایا موجود ہے۔ حکومت کا کام فقط اتنا ہے کہ اس ضابطہ کو ملک میں نافذ کر دے۔ اور اگر کسی باب میں انہیں کوئی دشواری پیش آئے تو اس کی بابت ہم سے پوچھ لے۔ دوسری طرف، اور بابِ نظم و نسق کو اس کا احساس تھا کہ جس فقہی ضابطہ کو یہ حضرات یہاں نافذ کرانا چاہتے ہیں، وہ آج سے صدیوں پہلے کے حالات کے مطابق مرتب ہوا تھا۔ اور موجودہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات

## پاکستان میں کش مکش

کے پیش نظر وہ ممکن العمل نہیں رہا۔ یہ حضرات ان دشواریوں کو جانتے تھے لیکن ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ کھل کر کہے کہ یہ ضابطہ دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہم اپنے زمانے کے حالات کے مطابق خود قوانین وضع کریں گے۔ چنانچہ وہ بھی اس اصطلاح کی آڑ میں اس سوال کوٹا لیتے رہے کہ پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔

یہ ہے وہ گرداب جس میں مملکت کی کشتی تیس سال سے مچھنی ہوئی ہے اور حساس قلوب کی ہزار تپش و غلش کے باوجود، ایک ایسے بھی ساحل مراد کی طرف نہیں بڑھی۔ پھر مشکل یہ ہے کہ یہ سوال قانون سازی تک ہی محدود نہیں، قدامت پرست طبقہ کا تقاضا ہے کہ اسلاف کا اتباع زندگی کے ہر شعبے میں ضروری ہے۔ وضع قطع، تراش تراش، رہن سہن، نشست و برخاست، خورد و نوش، حتیٰ کہ فکر و خیال تک میں ان کی عائد کردہ حدود و قیود کی پابندی لازمی ہے۔ زمانے کا سوچ، ہر نئی صبح، نئی دنیا میں اپنے جلو میں لاتا ہے، لیکن ان حضرات کا ارشاد ہے کہ کسی نئی بات کے متعلق ذہن میں خیال تک لانا بھی حرام ہے۔ ان کا یہ اعلان ہر خطبہ میں، ہر خطاب و منبر میں ہر کان میں مسلسل ڈالا جاتا ہے کہ

کلّ بداعتہ ضلّالۃ۔ وکلّ ضلّالۃ فی الناس

ہر نئی بات گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے کا موجب۔

اور یہ ہے جدید و قدیم کی وہ کش مکش جس میں ہماری نئی نسل اس بری طرح سے گمراہ ہے۔ اس صورت حال سے کچھ ہم ہی دوچار نہیں ہوئے، دنیا کی ہر مذہب پرست قوم کو اس سے واسطہ پڑا ہے۔ لیکن ان کے ان اس کا علاج آسان تھا۔ انہوں نے مذہب کو گرجوں اور مندروں میں بند کیا اور زندگی کے معاملات میں پوری پوری آزادی حاصل کر لی لیکن اسلام کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ افراد کا ذاتی اور پرائیویٹ معاملہ نہیں۔ یہ وہ نظام حیات ہے جو امت کی اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط اور ان کی مملکت کا بنیادی آئین اور دستور ہے جو ابد الابد تک قائم و دائم رہے گا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام کا تقاضا ہے کہ اس میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمیں ڈر ہے کہ یہاں بھی وہی حالت ہو جائے گی جو یورپ (یا دیگر مذہب پرست ممالک میں ہوئی ہے)۔ مذہب کو مساجد کے حجرہوں میں محبوس کر دیا جائے گا اور مملکت لادین ہو جائے گی۔ یعنی وہ وحی کے ابدی اصول و افکار کو بھی چھوڑ دے گی۔ اور یہ ہماری ہی نہیں، نوع انسانی کی انتہائی بد قسمتی ہو گی۔

اس کش مکش کو آپ قدیم و جدید کی آویزش بادیوں اور مذہب کی کشاکش کہہ لیجئے، لیکن اس باب میں خود مذہب پرست طبقہ (قدیم) کے اندر جو باہمی کش مکش ہے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدید ہے۔ یہاں اسلام کا اس قسم کا نقشہ قائم کرنے کی تجویز یا کوشش کی جا رہی ہے کہ پرسنل لاڈ کی حد تک ہر فرقہ کو اپنی اپنی فقہ پر عمل کرنے کی اجازت ہو۔ لیکن بالکل لازفقہ حنفی کے نافذ کئے جائیں کیونکہ اس فقہ کے پیروں کی یہاں اکثریت ہے۔ اس کے خلاف غیر حنفی فرقے (سنی اور شیعہ دونوں) احتجاج کر رہے ہیں کیونکہ وہ فقہ حنفی کو کتاب و سنت کی صحیح تعبیر تسلیم ہی نہیں کرتے۔ (اس کی مزید تشریح میں ذرا آگے چل کر پیش خدمت کروں گا)۔

یہ وہ کش مکش جس میں یہ بد قسمت ملک اس وقت بُری طرح اُلجھا ہوا ہے اور جس کا نتیجہ بڑا تباہ کن ہو سکتا ہے۔ اگر ملک میں کوئی ایسا طبقہ موجود ہے جو اس ملک کو تباہی سے بچانے کا احساس اور درد اپنے سینے میں رکھتا ہے تو اس کے لئے فی الواقعہ یہ گھڑی محشر کی ہے۔ اس طبقہ کو بہت بڑا جہاد کرنا پڑے گا۔ اور اس کے لئے سب سے پہلے وہ کچھ سنا پڑے گا جو امام ابوحنیفہؒ نے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے سنا تھا اور جو خود مجھے تئیس (اب تیس) سال سے سنا پڑ رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس طبقہ کے لئے یہ بشارت بھی ہے کہ اگر وہ اس خطہ پاک میں حقیقی اسلام کے احیاء میں کامیاب ہو گئے تو پھر وہ دین، مملکت پاکستان میں ہی قائم نہیں ہو گا، اس کے عالم گیر ہوجانے کے راستے بھی ہموار ہو جائیں گے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ دین الحق، تمام ادیانِ عالم پر غالب آ سکتا ہے، تو اس میں الحق کی خصوصیت کا سمجھ

دین الحق کے معنی

لینا نہایت ضروری ہے۔ عربی زبان میں حق اسے کہتے ہیں جو اپنے مقام پر حکم اور اُٹل بھی ہو، اور اس کے ساتھ ہی، عند الضرورت متحرک بھی۔ عرب اس مقام پر حق کا لفظ بولتے تھے، اسے سمجھ جایا جائے تو دین الحق کی بنیادی خصوصیت سامنے آجاتی ہے۔ آج کل ہمارے دروازوں میں قبضے (Hinges) لگے ہوتے ہیں لیکن پہلے زمانے میں دروازے کی چوڑی ساکٹ (socket) میں فٹ کی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دروازہ اپنے مقام پر حکم بھی رہتا تھا اور ضرورت کے مطابق کھلتا اور بند بھی ہوتا تھا۔ اس طریق عمل کو وہ لوگ حق سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ امام راغب حق کے معنی مطابقت اور موافقت کرتے ہیں۔ دین وہی الحق ہو سکتا ہے جس کی کیفیت دروازے کی طرح ہو کہ حفاظت کے لئے وہ حکم طور پر بند بھی ہو سکے اور آنے جانے کے لئے کھل بھی سکے۔ اگر دروازہ مستقل طور پر بند رہے تو اسے دروازہ نہیں کہا جائے گا۔ اس کی حیثیت جامد دیوار کی سی ہو جائے گی۔ اور اگر وہ ہمیشہ کھلا ہی رہے۔ بند نہ ہو سکے تو اس میں اور کھلے میدان میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ دروازہ، جب تک، حالات کے مطابق، کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے، دین کہلاتا ہے۔ جب وہ ایک جگہ جامد ہو جاتا ہے، مذہب بن جاتا ہے۔ اور جب چوڑی کھلا رہے تو سیکور نظام کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لہذا جو لوگ اسلام کو یہ حیثیت دین الحق زندہ کرنے کے متمنی ہیں، ان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اسے دروازے کی حیثیت سے از سر نو قائم کریں۔ یعنی ایسا نظام قائم کریں جس میں:-

- ۱۔ قرآن کریم کے اہری اور غیر متبدل اصول و افکار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، جزئی احکام اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے خود مرتب کئے جائیں۔ قرآنی اصول و اقدار تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ احکام میں عند الضرورت تغیر و تبدل اور حکم و اضافہ ہوتا رہے۔ ان قوانین کی تدوین کے سلسلہ میں، ان احکام و ضوابط سے استفادہ کیا جائے جو اس سے پہلے مختلف زمانوں میں مرتب ہوئے رہے ہیں۔
- ۲۔ قرآنی احکام کو نافذ کرتے ہوئے، موقع و محل، احوال و کوائف، قوم اور افراد کی ذہنی اور نفسیاتی سطح اور اپنے زمانے کے عام تمدنی، معاشرتی اور معاشی حالات کو سامنے رکھا جائے۔
- ۳۔ قرآن کریم نے جس قرآنی معاشرہ کو منتهی و مقصود قرار دیا ہے، اسے بلند رخصت، یعنی سنا رکھا جائے، اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ وہاں سے بتدریج اس نصب العین کی طرف آہستہ آہستہ بڑھایا جائے۔
- ۴۔ نبی اکرم کی جس سیرت طیبہ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے اس کے نمایاں خصلت و نمایاں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ اسے سیرت و کردار کا معیار قرار دیا جائے اور دیکھا جائے کہ قوم، انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے کس حد تک اس معیار پر پوری اترتی ہے۔
- ۵۔ نظام تعلیم ایسا مرتب کیا جائے جس سے ایک طرف، طلباء میں ایسے صلاحیت پیدا ہو جائے کہ



دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے، انہیں معلوم ہو کہ قرآن کریم اس باب میں کیا راہ نائی دیتا ہے، اور دوسری طرف، ان میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو کہ قرآنی اصول و اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آرزو ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ اور

۶۔ مملکت میں ایک ادارہ ایسا ہو (مثلاً سپریم کورٹ) جو اس بات پر نگاہ رکھے کہ مملکت کا کوئی قدم قرآن اصول و اقدار کے خلاف نہ اٹھے۔

اسیے نظام کے قیام کی مخالفت، دنیا کے ہر فرعون، ہامان اور قارون کی طرف سے ہوگی۔ یعنی ان ارباب سیاست کی طرف سے جو سیکولر حکومت قائم کرنے کے خواہاں ہوں۔ ان کے علاوہ قدامت پرست طبقے کی طرف سے اور نظام سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے بھی اس مخالفت میں، "خدا اور رسول" کے نام کو سب سے پہلے بطور حریہ استعمال کیا جائے گا تا کہ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے میں آسانی رہے۔ لہذا، اس نظام کے قیام کے لئے، مومنانہ فراغت کے ساتھ، قلندرانہ عزم اور بے باکانہ جرأت کی ضرورت ہوگی۔ یہ بھی وہ حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

یہ سوال کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقا کی گنجائش ہے یا نہیں، بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً مل میں ہونا چاہیے۔ بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف غور کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمر جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ

حَسْبُنَا كِتَابُ اللَّهِ

(خطباتِ اقبالؒ)

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

جس قوم اور جس ملک میں یہ روحِ عمری رہا ابھری، اسلامی نظام اسی میں قائم ہو سکے گا۔ باقی رہا مذہب، وہ خواہ عیسائیوں کا، یہودیوں کا، ہندوؤں کا، یا مسلمانوں کا۔ اس کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تدبیر کی فنون سازیاں یا تقدس کی سرکاریاں، اسے زمانے کے تقیڑوں سے بچا نہیں سکتیں۔ دین حق ہوتا ہے اور مذہب باطل۔ اِنَّ السَّاطِلَ كَانَتْ ذُھُوقًا۔ باطل کو ہر حال میں چھوڑنا ہوتا ہے۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے اور اس کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ سُنَّۃُ اللّٰهِ دَلَّیْلٌ تَجِدُہٗ لِمُسْتَقْدِمِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا۔

پہلے جملہ بتایا ہے، تشکیل پاکستان کے فوری بعد یہاں مطالبہ شروع کر دیا گیا کہ چونکہ یہ مملکت اسلام کے نام پر حاصل کی گئی ہے اس لئے یہاں اسلامی نظام نافذ اور اسلامی قوانین رائج ہوں گے۔ میں نے کہا کہ اس مطالبہ کو جمل نہ رکھیں۔ اس کی ذرا تشریح کیجئے۔ تو اس تشریح کی دوسری کہا گیا کہ یہاں "کتاب سنت"

کے مطابق قوانین رائج ہوں گے۔ میں نے کہا کہ "کتاب و سنت" کی روش سے کوئی ایسا مجموعہ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا، جس کا اطلاق تمام فرقوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اس لئے اس اصول کے مطابق یہاں اسلامی نظام کبھی قائم نہیں ہو سکے گا۔ مذہب پرست طبقہ کے پاس اس اعتراض کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کہ یہ منکرِ حدیث ہے، منکرِ نشانِ رسالت ہے، ملحد ہے، بے دین ہے، حتیٰ کہ کافر ہے۔ تئیس برس کی مسلسل مخالفت کے بعد، جماعتِ اسلامی رجو اس مخالفت پر یہاں سے آگے بڑھی، مکے امیر، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، کو یہ اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ پیٹک لاء کے معاملہ میں :-

کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔

(ایشیا - ۲۳ اگست سنہ ۱۹۷۷ء)

لہذا پرسنل لاء کی حد تک تو مختلف فرقوں کو اجازت ہوگی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کریں لیکن پیٹک لاء کے لئے فقہ حنفی کو رائج کیا جائے گا جو یہاں کی اکثریت کی فقہ ہے۔ اہل حدیث فرقہ کی طرف سے اس تجویز کی پہلے ہی سخت مخالفت ہو چکی تھی۔ شیعہ حضرات کی طرف سے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ کسی فرقے کو اس کا کیا حق حاصل ہے کہ جس فقہ کو ہم اسلامی تسلیم نہیں کرتے، اسے ہم سے بطورِ قوانین شریعت، زبردستی منوایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں یہاں تک کہہ دیا کہ

اگر سوادِ اعظم کے راہ نماؤں نے ہماری معروضات کو درخورِ اعتناء سمجھا اور اپنے طریقہ عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی تو ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے ہی سہی۔

(پمفلٹ - آئین پاکستان اور مسئلہ اسلامی فرقے - شائع کردہ

سید محمد رضا رضوی، کنوینر، ادارہ فلاح ملت پاکستان - حیدرآباد)

اگر یہاں یہ صورتحال پیدا ہوئی اور ملک خانہ جنگی کا اکھاڑہ بنا تو اس سے بچنے کی اس کے سوا کوئی شکل نظر نہیں آئے گی کہ یہاں سیکور نظام حکومت رائج کیا جائے۔ اور اگر یہاں سیکور نظام رائج کر دیا گیا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ مطالبہ ہوگا کہ اب پاکستان کو ہندوستان سے الگ رکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ دو قومی نظریہ یہاں پہلے سے ختم ہو چکا ہے کیونکہ یہاں غیر مسلموں کو ایک الگ قوم قرار نہیں دیا گیا اور نظام حکومت یہاں سیکور ہے۔ اس سے وہ بنیادی ختم ہو جاتی ہے جس پر مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کے مطالبہ کی غارت استوار ہوئی تھی۔ اور جب وہ بنیاد ہی ختم ہو چکی ہے تو اسے الگ مملکت

ملہ یہ اب (۱۹۷۷ء) حرم ہر چکے ہیں۔ اور جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے وہ مسئلہ کی بات ہے۔

